(غلام گردش)

اساتذہ اور معیارِ تعلیم

محفوظ صاحب کا پیغام ملا کہ تعلیمی معیار پر ضرور لکھوں۔ گرتا ہوا یا شائد برباد شدہ۔ موجودہ عجیب سا معیارِ تعلیم واقعی مقامِ عبرت ہے۔ آپکے لیے محفوظ صاحب ایک نام ہے مگر میرے لیے یہ قطعاً ایک نام نہیں ہے۔ یہ علم کی روشنی بکھیرنے والے وہ چراغ ہے جو قسمت والوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ کیڈٹ کالج حسن ابدال میں بچوں کو پڑھانے والے اُستاد۔ صرف محفوظ صاحب ہی کیا، سلیمی صاحب، بخاری صاحب، صدیقی صاحب، خطیب صاحب، مصباح صاحب، فقیر محمد صاحب اور دیگر اساتذہ ایسے نایاب لوگ تھے جنہوں نے پوری نہیں، مکمل زندگی صرف ایک درسگاہ میں طالبعلموں کو پڑھانے میں صَرف کردی۔ عملی طور پر دنیا سے کٹے رہے۔ مگر اپنے طالبعلموں سے علم کی بنیاد پر جڑے رہے۔ کمال کے لوگ، صاحبان، کمال کے لوگ۔ انکے بغیر ہم تمام طالبعلم کچھ بھی حاصل نہ کرسکتے تھے۔ ان لوگوں نے ہمیں اتنا محنت کش بنادیا کہ سوچیں تو حیرت ہوتی ہے۔

جب کیڈٹ کالج حسن ابدال گیا تو 1972 تھا۔ یعنی پچھلی صدی کا زمانہ۔ لائل پور سے یک دم ایک فوجی سکول میں جانا شروع میں حد درجہ مشکل تجربہ تھا۔ آٹھویں سے شروع ہوکر بارویں کلاس تک کی ایک حیرت انگیز درسگاہ۔ آٹھویں کلاس میں طالبعلم گیارہ بارہ سال کا ہی ہوتا ہے۔ بالکل کچی مٹی کی طرح۔ جس طرف چاہیں جاسکتا ہے۔ گھر سے دور، ہوسٹل میں۔ والدین کی عدم موجودگی میں جسطرح ان اساتذہ نے ہماری رہنمائی کی، وہ بذاتِ خود کمال ہے۔ حقیقت ہے، ان لوگوں نے ہمیں انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔ اعتماد دیا اور اتنا اعلیٰ معیارِ تعلیم دیا، جسکی توقع آج کے دور میں کرنا عبث ہے۔ بات محفوظ صاحب سے شروع ہوئی تھی۔ طویل قامت، سرخ وسفید انسان۔ بھاری آواز اور حد درجہ نرم خو، سائنس کے اُستاد تھے۔ عادت تھی کہ میں آگے والے ڈیسکوں پر بیٹھتا تھا۔ اسلیے کہ اُستاد جو کچھ بھی بولیں، اسکو لکھنے میں آسانی رہے۔ سننے میں بھی آسانی رہے۔ محفوظ صاحب، ڈائس پر کھڑے ہوکر زوردار آواز میں سبق پڑھاتے تھے۔ کئی بار سفید چاک انکے ہاتھ میں ہوتا تھا، بلیک بورڈ پر مسلسل لکھ رہے ہوتے تھے۔ پھر کلاس کی طرف رخ کرکے دہراتے تھے۔ میرا نہیں خیال کہ کسی بھی شاگرد کو سائنس کا سبق سمجھ نہ آیا ہو۔ یاد ہے کہ وہ ہاؤس ماسٹر بھی تھے۔ یعنی ایک ہوسٹل کے وارڈن۔ جناح ونگ یا شائد حیدر ونگ۔ میرا خیال ہے جناح ونگ۔ جیسے ہی پریڈ ختم ہوتا تھا اور ہم لوگ ہوسٹل پہنچتے تھے تو تمام ہاؤس ماسٹرز کا کام دوبارہ شروع ہوجاتا تھا۔ بچوں کو گیمز پر لے جانا۔ ڈنر کیلیے میس تک پہنچانا۔ اور پڑھنے کا ایک پیریڈ کروانا۔ یہ سب کچھ روز کے معمولات تھے۔ ویسے ڈنر سے پہلے بھی ایک پریپ یعنی پڑھنے کا پریڈ ہوتا تھا۔ ہم طالبعلم تو محنت کرتے ہی تھے۔ مگر محفوظ صاحب اور تمام ہاؤس ماسٹر، ہماری جتنی ہی محنت کرتے تھے۔ شائد ہم سے بھی زیادہ۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اس طرح کے لوگ اب کہاں گئے ہیں۔ ہیں بھی کہ نہیں۔ اندازہ ہے کہ ضرور موجود ہونگے۔ اچھے اساتذہ کے بغیر معاشرے بالکل جنگل بن جاتے ہیں۔ جو تھوڑا سا دم ہمارے ملک میں موجود ہے وہ اچھے اساتذہ کی وجہ سے ہی ممکن ہے۔ محفوظ صاحب کو میرا نام چالیس سال بعد بھی یاد ہے، یہ بھی ایک پائیدار بات ہے۔ ویسے حسن ابدال میں، ہمارے پرنسپل صاحب، کرنل این ڈی حسن اور تمام اساتذہ کو تمام طالبعلموں کے نام اَزبر یاد تھے۔ یقین

فرمایئے میں اکثر نام بھول جاتا ہوں۔مگران لوگوں کی یاداشت ایسی تھی کہ ہر طالبعلم کا نام سو فیصد یاد تھا۔ایک دن صدیقی صاحب کہنے لگے کہ کالج کے اساتذہ،تمام طالبعلموں کو انکے والدین سے زیادہ جانتے اور سمجھتے ہیں۔یہ بات مکمل طور پر درست تھی۔خیال رہے کہ والدین سے تو ہماری ملاقات صرف چھٹیوں میں ہوتی تھی۔زیادہ وقت تو کالج میں اساتذہ کے ساتھ گزرتا تھا۔لہذا وہ تمام،ہمیں والدین سے سو فیصد بہتر جانتے اور پہچانتے تھے۔ویسے اب میں اپنے ماضی کے اساتذہ پر غور کرتا ہوں،تو حیرت ہوتی ہے۔جس لگن اور توانائی سے ہمیں پڑھاتے تھے،اس احساس کو موجودہ زمانے میں مفقود پاتا ہوں۔

سلیمی صاحب،عمرونگ کے ہاؤس ماسٹر تھے۔داڑھی رکھی ہوئی تھی۔درمیانے قد کے انسان تھے۔سائنس میں زولوجی پڑھاتے تھے۔کمال کے اُستاد تھے۔فجر سے بہت پہلے اُٹھتے۔پھر طالبعلموں کو فجر کی نماز کیلیئے اُٹھاتے تھے۔میں اورنگ زیب ونگ میں تھا۔عمرونگ سے تھوڑے سے فاصلے پر۔سلیمی صاحب روز اپنے ہوسٹل سے اورنگ زیب ونگ آتے۔پہلے محی الدین کو اُٹھاتے اور پھر مجھے۔سردیوں میں ایک براؤن کلر کا سواتی گاؤن پہنتے تھے۔پانچ برس فجر کی نماز مسجد میں انکے ساتھ پڑھتا رہا ہوں۔ہر طالبعلم کیلیئے شفیق اور اسے باکردار بنانا چاہتے تھے۔دھیمہ مزاج رکھنے والے سلیمی صاحب۔جب زولوجی پڑھاتے تو لگتا تھا کہ انہیں کتاب لفظ بہ لفظ یاد ہے۔میٹرک میں ایک عجیب واقعہ ہوا۔سائنس کی آدھی کتابیں پڑھ چکے تھے کہ حکومت نے نصاب تبدیل کر دیا۔سلیمی صاحب نے کلاس میں اعلان کیا کہ اب نئی کتاب سے سبق یاد کرنے ہیں اور اب وقت آدھا رہ گیا ہے۔یقین فرمایئے ہم نے پورے سال کا کورس آدھے سال میں صرف اسلیے پڑھ لیا کہ سلیمی صاحب پڑھاتے ہیں۔نہ وہ گھبرائے اور نہ ہمیں پریشان ہونے دیا۔کمال کے انسان تھے۔آج بھی انکے چہرے کی مسکراہٹ ذہن میں نقش ہے۔

جہاں محفوظ صاحب اور سلیمی صاحب جیسے سائنس کے اساتذہ تھے،وہاں اسلامیات پڑھانے والے خطیب صاحب بھی تھے۔خطیب صاحب کا نام کیا تھا۔کسی کو معلوم نہیں تھا۔سب انہیں خطیب صاحب کے نام سے ہی جانتے تھے۔اسلامیات کے ٹیچر ہونے کے ساتھ ساتھ کالج کی مسجد کے امام بھی تھے۔حیرت انگیز شخص۔سائیکل پر آتے تھے۔طویل قامت تھے۔سائیکل پر انکی ٹانگیں دوہری سی ہو جاتی تھیں۔اکثر شیروانی پہنا کرتے تھے۔دین سے شدید محبت کرتے تھے۔انہیں یقین تھا کہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ ضرور ہوگی۔اس بات کا بھی یقین تھا کہ دین کا غلبہ طالبعلموں کے ذریعے سے ہی رونما ہوگا۔جب فجر کیلیئے طالبعلموں کو جگانے آتے،تو ہوسٹل کے شروع میں ہی بلند آوازوں سے بولنا شروع کر دیتے۔انکے کہے ہوئے فقرے کمال تھے۔کہتے تھے۔تم لوگ ہی روس اور امریکہ سے ملک کو آگے نکالو گے۔تم لوگ ہی اسلام کے سپاہی ہوگے۔فوجی سکول تھا۔لہذا،اکثر طالبعلم فوج میں گئے اور وہاں جا کر قوم کیلیئے فولاد بن گئے۔خطیب صاحب کئی بار باتیں کرتے کرتے رو پڑتے تھے۔انہیں غم تھا کہ مسلمان دنیاوی معاملات میں اتنا پیچھے کیسے رہ گئے۔یقین تھا کہ نوجوان ہی اس قوم کا اصل اثاثہ ہیں۔امامت میں کمال کی خوش الحان تلاوت کرتے تھے۔خطیب صاحب متوازن انسان تھے اور دین میں دلیل کے قائل تھے۔پاٹ دار آواز میں لیکچر دیتے تھے۔نصاب میں دی گئی سورتیں انہوں نے ہمیں دنوں میں یاد کروائی تھیں۔خطیب صاحب دنیا میں آئے ہی اسلامیات کی تعلیم دینے کیلیئے تھے۔شائد انکی زندگی کا مقصد ہی یہی تھا۔

یہاں میں صدیقی صاحب کا ذکر کرنا ضرور چاہتا ہوں۔اُردو کے استاد تھے اوراورنگ زیب ونگ کے ہاؤس ماسٹر بھی تھے۔یعنی ان سے چوبیس گھنٹے کا تعلق تھا۔جتنے سخت مزاج نظر آتے تھے۔دل کے اتنے ہی نرم۔اردو زبان کو جانتے تھے، پہچانتے تھے۔پڑھاتے بھی کمال تھے۔آج کے طالبعلموں کو پتہ نہیں ہوگا۔ستر کی دہائی میں اردو میں مختلف شعراورنثر نگاروں کے حالات زندگی یاد کرنا نصاب میں شامل تھا۔یہ انسانی یاداشت کا کافی سخت امتحان تھا۔میر تقی میر،اسداللہ خان غالب سے لیکر الطاف حسین حالی تک سب شامل تھے۔یہی معاملہ نثر نگاروں کا بھی تھا۔حالات زندگی میں ہر تفصیل تھی۔شاعر کہاں پیدا ہوا۔کن کن آفات سے گزرا۔کلام کیا تھا۔شاعری کی خصوصیات کیسی تھیں۔ویسے کوئی بھی لکھاری یا سوچنے والا ایسا نہیں ہے جو مشکلات کی بھٹی کی تپش سے نہ گزرا ہو۔ماضی سے حالات دیکھیے اور ہمارے دور تک آجایئے۔سوچنے اور لکھنے والے انسان حد درجہ مشکلات اور امتیازی سلوک سے گزرتے ہیں۔صدیقی صاحب جب کسی شاعر کے حالات زندگی یاد کرواتے تھے تو اس وقت تو ذہن نشین ہو جاتے تھے۔مگر کچھ دن بعد، دوسرے شاعر کے حالات یاد کرتے ہوئے گڈمڈ ہو جاتے تھے۔کبھی میر تقی میر کے زندگی کے معاملات آتش سے مل جاتے تھے اور کبھی غالب کی مشکل زندگی، انشااللہ خان انشاء سے مناسبت اختیار کر جاتی تھی۔ایک دن صدیقی صاحب کو مشکل بتائی تو انہوں نے سنجیدگی سے مشورہ دیا کہ یاد رکھنے کیلئے تواتر کی ضرورت ہے۔میں نے یہ نسخہ گرہ سے باندھ لیا۔اسکے بعد کوئی چیز بھی حافظے سے باہر نہ جاسکی۔حالات زندگی تو اَزبر ہوئے ہی،مگر سائنس اور دیگر مضامین بھی مسلسل مشق کے ذریعے مسخر ہو گئے۔آٹھویں جماعت میں گرمیوں کی چھٹیوں کا ہوم ورک ملا۔اردو میں ایک کتاب کو پڑھنا تھا اور پھر اس پر تجزیہ لکھنا تھا۔پتہ نہیں، کہاں سے مجھے جوش ملیح آبادی کی ''یادوں کی بارات'' مل گئی۔پڑھی اور اس پر چار صفحے لکھ ڈالے۔صدیقی صاحب نے پڑھا تو پوچھنے لگے کہ کیا تم نے واقعی اتنی ضخیم کتاب پڑھی ہے۔یہ تجزیہ کسی اور سے تو نہیں لکھوایا۔وثوق سے بتایا کہ میں نے کتاب ہی پڑھی ہے۔صدیقی صاحب میرا جواب سنکر حیران رہ گئے۔یادوں کی بارات میں کئی ایسی باتیں درج تھیں جو بچوں کیلئے ہرگز ہرگز نہیں تھیں۔ہاں، مجھے کتاب کے اکثر مندرجات سمجھ نہیں آئے تھے۔مگر اپنی سمجھ بوجھ کے تحت جو یاد رکھ سکتا تھا، یاد رکھا اور لکھ ڈالا۔اردو کی تدریس میں صدیقی صاحب کا کوئی مقابلہ نہیں تھا۔آج میں جو ٹوٹی پھوٹی اردو لکھ سکتا ہوں،اس میں صدیقی صاحب کا عمل دخل ستر سے اَسی فیصد تک ہے۔حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے۔کچھ عرصہ پہلے دنیا سے چل بسے۔خدا،انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔صرف ایک کالم میں اپنے اساتذہ کے متعلق لکھنا ناممکن ہے۔

ہاں،آخر میں محفوظ صاحب کے حکم کے مطابق معیارِ تعلیم پر صرف یہ لکھونگا، کہ نہ وہ اساتذہ رہے اور نہ وہ طالبعلم۔نہ وہ محنت کی عادت رہی اور نہ ہی علم سے عشق کرنے کی روش۔نہ سبق اَزبر کرنے کی وہ جدوجہد رہی اور نہ کتاب سے وہ محبت۔ان حالات میں معیارِ تعلیم کیا ہوگا۔اسکا کیا جواب دوں۔کیسے لکھوں کہ جس عنصر کا وجود ہی نہیں ہے،اسکا معیارِ کیا ہوگا۔شائد اسے عدم معیار کہنا بہتر ہوگا۔یا شائد کچھ نہ کہنا زیادہ بہتر!

راؤ منظر حیات